مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کا تفسیری منہج

——————— جناب ظفر احمد الاثری (لندن)

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی تفسیر 'تفہیم القرآن' بیسویں صدی عیسوی میں اردو زبان میں لکھی جانے والی اہم تفاسیر میں سے ہے۔ مولانا نے اس کی تالیف میں نہ صرف قدیم مفسرین سے استفادہ کیا ہے، بلکہ جدید علوم اور عصری معلومات سے بھی بھرپور فائدہ اٹھایا ہے اور جدید ذہن کو مطمئن کرنے اور اس کے اعتراضات و اشکالات کا جواب فراہم کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ زیرنظر مقالہ میں تفہیم القرآن کے اقتباسات کی روشنی میں مولانا کے تفسیری منہج کا مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ اس تفسیر کے امتیازات و خصائص، فنّی خوبیوں اور عصری معنویت کا مبسوط اور تحقیقی مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے۔ (رضی الاسلام)

مولانا سید ابوالاعلی مودودیؒ (۱۹۰۳-۱۹۷۹ء) نے جہاں اپنی ولولہ انگیز تحریروں سے مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنے کی کوشش کی وہیں انھوں نے قرآن پاک کی تفسیر لکھنے کا فیصلہ کیا، تاکہ لوگوں کو قرآن کریم کا فہم حاصل ہو اور اس کی روح اور اس کا حقیقی مدعا ان تک پہنچ سکے۔ وہ تفہیم القرآن کے دیباچہ میں فرماتے ہیں: ''میں ایک مدت سے محسوس کر رہا تھا کہ ہمارے عام تعلیم یافتہ لوگوں میں روح قرآن تک پہنچنے اور اس کتاب پاک کے حقیقی مدعا سے روشناس ہونے کی جو طلب پیدا ہوگئی ہے اور روز بروز بڑھ رہی ہے وہ مترجمین و مفسرین کی قابل قدر مساعی کے باوجود ہنوز تشنہ ہے۔ اس کے ساتھ میں یہ احساس بھی اپنے اندر پا رہا تھا کہ اس تشنگی کو بجھانے کے لیے کچھ نہ کچھ خدمت میں بھی کرسکتا ہوں۔ انہی دونوں احساسات نے مجھے اس کوشش پر مجبور کیا''۔ (تفہیم القرآن، جلد اول)

یوں تو قرآن مجید کی تفسیریں ہر زمانہ میں مختلف زبانوں میں لکھی گئی ہیں اور وہ اپنے اپنے زمانہ کی ضرورت پوری کرتی رہی ہیں، لیکن موجودہ زمانے میں، جب کہ ذہنوں کو جدید علوم،

سائنس اور ٹکنالوجی نے مسخر کرلیا ہے، ایک ایسی تفسیر کی ضرورت تھی جو اعلیٰ معیاری زبان میں ہو اور ساتھ ہی وہ دل ودماغ میں پیدا ہونے والے تمام شکوک وشبہات کا جواب بھی فراہم کرتی ہو۔ مولانا مودودیؒ نے وقت کے تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے قرآن کی ایسی تفسیر لکھی کہ اس کے مطالعہ سے ذہن میں ابھرنے والے تمام سوالات کا اطمینان بخش جواب مل جاتا ہے۔ عقل پرست لوگ اسلام اور شریعت کے مختلف مسائل پر جو طرح طرح کے سوالات اور اعتراضات کرتے ہیں، مولانا نے اس تفسیر میں ان کا بڑا مسکت جواب فراہم کیا ہے۔ اس تفسیر میں احادیث، سیرتِ نبوی اور اسوۂ صحابہ وصحابیات کی روشنی میں قرآن پاک کی بہترین تشریح کی گئی ہے۔

اس تفسیر میں مولانا نے صحف سماوی سے استشہاد کے ساتھ ان مواقع اور مباحث کی بھی نشان دہی کی ہے جن میں تحریف یا ردوبدل کردیا گیا ہے، ساتھ ہی ان میں موجود تضادات کو بھی واضح کیا ہے۔ یہ تفسیر مستشرقین اور عیسائی مشنریوں کی غلط بیانیوں کا بھی مدلل جواب ہے۔

تفسیری منہج

مولانا مودودیؒ ہر سورہ کے دیباچہ میں مضمون یا موضوع ومباحث کے عنوان کے تحت بہت مربوط انداز میں اس سورہ کا خلاصہ اور تجزیہ پیش کرتے ہیں، جس سے پوری سورہ کا مرکزی مضمون ذہن میں بیٹھ جاتا ہے۔ بعض سورتوں کے درمیان معنوی اور موضوعی مناسبت اور ربط بیان کرتے ہیں۔ کہیں کہیں سورہ کا تجزیہ آیتوں کا گروپ بنا کر پیش کرتے ہیں۔ یہ اسلوب خاص طور پر سورۂ ملک سے اخیر تک بیش تر سورتوں کی تفسیر میں نظر آتا ہے۔ سورہ کے دیباچہ میں اور دورانِ تفسیر بھی مولانا اس کی تعیین کرتے ہیں کہ یہاں کن لوگوں سے خطاب کیا جارہا ہے۔ سورتوں کے آغاز میں وہ بتاتے ہیں کہ یہ نام کیوں اور کہاں سے ماخوذ ہے، پھر زمانۂ نزول بیان کرتے ہیں، اس کے ساتھ اجزائے مضمون کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ اگر وہ سورہ مختلف اوقات میں نازل ہوئی ہے تو اس کا ذکر کرکے ان اوقات کو متعین کرتے ہیں۔ زمانۂ نزول بیان کرنے کے بعد شانِ نزول بیان کرتے ہیں۔ اس ضمن میں سورتوں کا پس منظر پیش کرتے ہیں، جس میں احادیث اور تاریخ کی کتابوں کی مدد سے طویل گفتگو کرتے ہیں اور سورتوں سے متعلق سارے حقائق پیش کرتے ہیں، جن سے سورتوں کو سمجھنے میں بہت آسانی

ہوتی ہے۔ بعض وقت شانِ نزول سے پہلے خطاب اور مباحث کے تحت سورہ کا خطاب کن لوگوں سے ہے؟ اس کی طرف اشارہ کرتے ہیں، جیسا کہ سورۂ آل عمران میں ہے اور کبھی شانِ نزول اور مباحثِ سورہ کو ایک ساتھ ذکر کرتے ہیں، مثلاً سورۂ نساء کے دیباچہ میں۔ اس سے سورہ کے مضامین کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ کبھی شان نزول اور مباحث (یعنی مضامینِ سورہ) کو الگ الگ موضوع بنا کر بیان کرتے ہیں، جیسا کہ انھوں نے سورۂ المائدۃ اور سورۂ الانعام کے دیباچوں میں کیا ہے۔ تاریخی پس منظر کا ذکر انھوں نے ۲۳ سورتوں میں کیا ہے۔ اس کے علاوہ تمام سورتوں کے دیباچوں میں نام، زمانۂ نزول، پھر موضوع اور مباحث کا ذکر ہے، صرف چند سورتوں میں اس سے مختلف اسلوب ہے۔ مثلاً سورۂ توبہ میں نام، بسم اللہ نہ لکھنے کی وجہ، زمانۂ نزول اور اجزاء سورہ سے بحث کرنے کے بعد تاریخی منظر کا تذکرہ کیا ہے، پھر عرب کی تسخیر، غزوۂ تبوک، مسائل و مباحث کا ذکر ہے۔ سورۂ یوسف میں زمانہ وسببِ نزول بیان کرنے کے بعد مقاصدِ نزول کو بیان کیا ہے۔ اس کے بعد مباحث و مسائل اور تاریخی و جغرافی حالات کا ذکر کیا ہے۔

سورتوں کا زمانۂ نزول

مولانا مودودیؒ سورتوں کا زمانۂ نزول بسا اوقات احکام اور واقعات کی روشنی میں طے کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر سورۂ نساء کے زمانۂ نزول کے بارے میں فرماتے ہیں:

''یہ سورہ متعدد خطبوں پر مشتمل ہے، جو غالباً ۳ ہجری کے اواخر سے لے کر ۴ ہجری کے اواخر یا ۵ ہجری کے اوائل تک مختلف اوقات میں نازل ہوئے ہیں۔ اگرچہ یہ تعین کرنا مشکل ہے کہ کس مقام سے کس مقام تک کی آیات ایک سلسلۂ تقریر میں نازل ہوئیں تھیں اور ان کا ٹھیک زمانۂ نزول کیا ہے، لیکن بعض احکام اور واقعات کی طرف بعض اشارے ایسے ہیں جن کے نزول کی تاریخیں ہمیں روایات سے معلوم ہو جاتی ہیں، اس لیے ان کی مدد سے ہم ان مختلف تقریروں کی ایک سرسری سی حد بندی کر سکتے ہیں، جن میں یہ احکام اور یہ اشارے واقع ہوئے ہیں۔ مثلاً ہمیں معلوم ہے کہ وراثت کی تقسیم اور یتیموں کے حقوق کے متعلق ہدایات جنگ احد کے بعد نازل ہوئیں تھیں، جب کہ مسلمانوں کے ستر آدمی شہید ہو گئے تھے اور مدینہ کی چھوٹی سی بستی میں اس حادثے کی وجہ سے بہت سے گھروں میں یہ سوال پیدا ہو گیا تھا کہ شہداء کی میراث کس طرح تقسیم کی جائے اور جو یتیم بچے انہوں نے چھوڑے ہیں

ان کے مفاد کا تحفظ کیسے ہو۔ اس بنا پر ہم قیاس کر سکتے ہیں کہ ابتدائی چار رکوع اور پانچویں رکوع کی پہلی تین آیتیں اسی زمانہ میں نازل ہوئی ہوں گی۔ (تفہیم القرآن، سورہ نساء، جلد اول)

مولانا مودودیؒ مکی سورتوں کے زمانۂ نزول کو ان کے مضامین اور اندازِ بیان پر غور کر کے یا روایات کی روشنی میں اور سورتوں کی اندرونی شہادت کو سامنے رکھ کر طے کرتے ہیں۔ رہیں مدنی سورتیں تو ان کا زمانہ آسانی سے معلوم ہو جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں وہ لکھتے ہیں:

''جہاں تک مدنی سورتوں کا تعلق ہے ان میں سے تو قریب قریب ہر ایک کا زمانہ معلوم ہے، یا تھوڑی سی کاوش سے متعین کیا جا سکتا ہے، بلکہ ان کی بہ کثرت آیتوں کی انفرادی شانِ نزول تک معتبر روایات میں مل جاتی ہے، لیکن مکی سورتوں کے متعلق ہمارے پاس اتنے مفصل ذرائع موجود نہیں ہیں۔ بہت کم سورتیں یا آیتیں ایسی ہیں جن کے زمانۂ نزول اور موقع نزول کے بارے میں کوئی صحیح و معتبر روایت ملتی ہو، کیونکہ اس زمانہ کی تاریخ اس قدر جزئی تفصیلات کے ساتھ مرتب نہیں ہوئی ہے جیسی مدنی دور کی تاریخ ہے۔ اس وجہ سے مکی سورتوں کے معاملہ میں ہم کو تاریخی شہادتوں کے بجائے زیادہ تر ان اندرونی شہادتوں پر اعتماد کرنا پڑتا ہے جو مختلف سورتوں کے موضوع، مضمون اور انداز بیان میں اور اپنے پس منظر کی طرف ان کے جلی یا خفی اشارات میں پائی جاتی ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ اس نوعیت کی شہادتوں سے مدد لے کر ایک ایک سورہ اور ایک ایک آیت کے متعلق یہ تعین نہیں کیا جا سکتا کہ یہ فلاں تاریخ کو یا فلاں سنہ میں فلاں موقع پر نازل ہوئی ہے۔ زیادہ صحت کے ساتھ جو کچھ کہا جا سکتا ہے وہ صرف یہ ہے کہ ایک طرف ہم مکی سورتوں کی اندرونی شہادتوں کو، اور دوسری طرف نبی ﷺ کی مکی زندگی کی تاریخ کو آمنے سامنے رکھیں اور پھر دونوں کا تقابل کرتے ہوئے یہ رائے قائم کریں کہ کون سی سورہ کس دور سے تعلق رکھتی ہے۔ (سورہ الانعام، جلد اول)

اسی طرح اگر کسی سورہ کے بارے میں متعدد روایات منقول ہیں تو وہاں مولانا تمام روایتیں جمع کر کے ان کی روشنی میں زمانۂ نزول متعین کرتے ہیں۔ اس کی مثال سورۂ رحمان ہے، جس میں انھوں نے پہلے تمام روایتیں جمع کر دی ہیں، پھر ان کا تجزیہ کر کے اپنی رائے پیش کی ہے۔

خطاب کی تعیین

خطاب کی تعیین سے آیات کا مفہوم سمجھنے اور حالات پر ان کا انطباق کرنے میں مدد

ملتی ہے۔ اگر خطاب کی تعیین صحیح نہ ہو تو آیات کے معانی اور مفہوم کو سمجھنے میں دشواری پیش آسکتی ہے اور ان کی صحیح تاویل مشکل ہو جاتی ہے۔ مولانا مودودیؒ نے اپنی تفسیر کے دوران اور سورت کے دیباچہ میں بھی اس بات کی وضاحت کی ہے کہ کن لوگوں سے سورت میں خطاب کیا گیا ہے۔ وہ تعیین کرتے ہیں کہ خطاب کہاں سے شروع ہو رہا ہے اور کہاں ختم ہو رہا ہے۔ اسی طرح وہ بدلتے ہوئے خطاب کی بھی نشان دہی کرتے ہیں، مثلاً سورہ بقرہ آیت ۴۰ کی تشریح میں لکھتے ہیں: ''پچھلے چار رکوعوں میں تمہیدی تقریر تھی، جس کا خطاب تمام انسانوں کی طرف تھا۔ اب یہاں سے، یعنی (اے بنی اسرائیل! ذرا خیال کرو میری اس نعمت کا جو میں نے تم کو عطا کی تھی) چودھویں رکوع تک مسلسل ایک تقریر اس قوم کو خطاب کرتے ہوئے چلتی ہے جس میں کہیں کہیں عیسائیوں اور مشرکین عرب کی طرف بھی کلام کا رخ پھر گیا ہے اور موقع موقع سے ان لوگوں کو بھی خطاب کیا گیا ہے جو حضرت محمد ﷺ کی دعوت پر ایمان لائے تھے۔ (تفہیم القرآن، سورہ بقرہ، جلد اول، حاشیہ ۵۶)

سورۂ حج میں تین مختلف گروہوں سے خطاب کیا گیا ہے۔ اس سورہ کے دیباچہ میں مولانا لکھتے ہیں: ''اس سورہ میں تین گروہ مخاطب ہیں: مشرکین مکہ، مذبذب اور متردد مسلمان اور مومنین صادقین۔ مشرکین سے خطاب کی ابتدا مکے میں کی گئی اور مدینہ میں اس کا سلسلہ پورا کیا گیا۔ اس خطاب میں ان کو پورے زور کے ساتھ متنبہ کیا گیا..... مذبذب مسلمان، جو خدا کی بندگی قبول تو کر چکے تھے، مگر اس راہ میں کوئی خطرہ برداشت کرنے کے لیے تیار نہ تھے، ان کو خطاب کرتے ہوئے سخت سرزنش کی گئی ہے..... اہل ایمان سے خطاب دو طریقوں پر کیا گیا ہے۔ ایک خطاب ایسا ہے جس میں وہ خود بھی مخاطب ہیں اور عرب کی رائے عام بھی اور دوسرے خطاب میں صرف اہل ایمان مخاطب ہیں۔ پہلے خطاب میں مشرکین مکہ کی اس روش پر گرفت کی گئی کہ انہوں نے مسلمانوں کے لیے مسجد حرام کا راستہ بند کر دیا ہے..... دوسرے خطاب میں مسلمانوں کو قریش کے ظلم کا جواب طاقت سے دینے کی اجازت عطا کی گئی ہے۔'' (تفہیم القرآن، دیباچہ سورہ حج)

قرآن کریم میں خطاب جیسے جیسے بدلتا ہے موضوع بھی بدلتا ہے اور انداز اور اسلوب بھی۔ اس کی وضاحت مولانا مودودیؒ نے سورۂ اعراف کے دیباچہ میں بہت اچھی طرح

کی ہے۔ فرماتے ہیں: ''اس سورہ کا مرکزی مضمون دعوتِ رسالت ہے۔ ساری گفتگو کا مدعا یہ ہے کہ مخاطبوں کو خدا کے فرستادہ پیغمبر کی پیروی اختیار کرنے پر آمادہ کیا جائے۔ لیکن اس دعوت میں انذار (تنبیہ اور ڈراوے) کا رنگ زیادہ نمایاں پایا جاتا ہے، کیونکہ جو لوگ مخاطب ہیں (یعنی اہل مکہ) انہیں سمجھاتے سمجھاتے ایک طویل زمانہ گزر چکا ہے اور ان کی گراں گوشی، ہٹ دھرمی اور مخالفانہ ضد اس حد کو پہنچ چکی ہے کہ عن قریب پیغمبر کو ان سے مخاطبہ بند کر کے دوسروں کی طرف رجوع کرنے کا حکم ملنے والا ہے۔ اس لیے تفہیمی انداز میں قبول رسالت کی دعوت کے ساتھ ان کو یہ بھی بتا جا رہا ہے کہ جو روش تم نے اپنے پیغمبر کے مقابلہ میں اختیار کر رکھی ہے ایسی روش پہلے کی قومیں اپنے پیغمبروں کے مقابلہ میں اختیار کر کے بہت برا انجام دیکھ چکی ہے۔ پھر چونکہ ان پر حجت تمام ہونے کے قریب آ گئی ہے اس لیے تقریر کے آخری حصہ میں دعوت کا رخ ان سے ہٹ کر اہل کتاب کی طرف پھر گیا ہے اور ایک جگہ تمام دنیا کے لوگوں سے عام خطاب کیا گیا ہے، جو اس بات کی علامت ہے کہ اب ہجرت قریب ہے اور وہ دور، جس میں نبی کا خطاب تمام تر اپنے قریب کے لوگوں سے ہوا کرتا ہے، خاتمہ پر آ لگا ہے۔

دورانِ تقریر میں چونکہ خطاب کا رخ یہود کی طرف بھی پھر گیا ہے اس لیے ساتھ ساتھ دعوتِ رسالت کے اس پہلو کو بھی واضح کر دیا گیا کہ پیغمبر پر ایمان لانے کے بعد اس کے ساتھ منافقانہ روش اختیار کرنے، اور سمع و طاعت کا عہد استوار کرنے کے بعد اسے توڑ دینے، اور حق و باطل کی تمیز سے واقف ہو جانے کے بعد باطل پرستی میں مستغرق رہنے کا انجام کیا ہے۔ (تفہیم القرآن، دیباچہ سورۂ اعراف)

قرآن میں کبھی خطاب نبی سے ہوتا ہے، مگر اصل مقصود دوسروں کو سنانا ہوتا ہے، مثلاً سورہ یونس آیت ۹۴ میں مولانا نے لکھا ہے: ''یہ خطاب بظاہر نبی ﷺ سے ہے، مگر دراصل بات ان لوگوں کو سنانی مقصود ہے جو آپ کی دعوت میں شک کر رہے ہیں۔ اور اہل کتاب کا حوالہ اس لیے دیا گیا ہے کہ عرب کے عوام تو آسمانی کتابوں کے علم سے بے بہرہ تھے، ان کے لیے یہ آواز ایک نئی آواز تھی، مگر اہل کتاب کے علماء میں سے جو لوگ متدیّن اور منصف مزاج تھے وہ اس امر کی تصدیق کر سکتے تھے کہ جس چیز کی دعوت قرآن دے رہا ہے یہ وہی چیز ہے جس کی دعوت تمام پچھلے انبیاء دیتے رہے ہیں''۔ (تفہیم القرآن، جلد دوم، سورہ یونس حاشیہ ۹۶)

قرآن مجید میں مختلف مواقع پر مسلمانوں کو خطاب کرکے کہا ہے کہ ''اے لوگو جو ایمان لائے ہو''۔ اس سے کون سے مسلمان مراد ہیں؟ مولانا مودودیؒ کہتے ہیں کہ سیاق و سباق اور سلسلۂ کلام کے ذریعہ اس کی تعیین ہوتی ہے۔ سورۂ احزاب کے حاشیہ ۱۱۸ میں انھوں نے لکھا ہے: ''یہ بات ملحوظ خاطر رہے کہ قرآن مجید میں 'اے لوگو جو ایمان لائے ہو' کے الفاظ سے کہیں سچے اہل ایمان کو خطاب کیا گیا ہے اور کہیں مسلمانوں کی جماعت بحیثیت مجموعی مخاطب ہے، جس میں مومن اور منافق اور ضعیف الایمان سب شامل ہیں اور کہیں روئے سخن خالص منافقین ہی کی طرف ہے۔ منافقین اور ضعیف الایمان لوگوں کو الذین آمنوا کہہ کر جب مخاطب کیا جاتا ہے تو اس سے مقصود ان کو شرم دلانا ہوتا ہے کہ تم لوگ دعوی تو ایمان لانے کا کرتے ہو اور حرکتیں تمہاری یہ کچھ ہیں۔ سیاق و سباق پر غور کرنے سے بہ آسانی معلوم ہو جاتا ہے کہ کس جگہ الذین آمنوا سے مراد کون لوگ ہیں۔ یہاں سلسلۂ کلام صاف بتا رہا ہے کہ مخاطب عام مسلمان ہیں۔'' (تفہیم القرآن، جلد۴، سورہ احزاب، حاشیہ ۱۱۸)

شان نزول

شان نزول کا کیا مطلب ہوتا ہے؟ اس کی وضاحت مولانا مودودیؒ نے سورۂ دہر کے دیباچہ میں اس طرح کی ہے:

''شان نزول کے بارے میں بہت سی روایات کا حال یہی ہے کہ کسی آیت کے متعلق جب یہ کہا جاتا ہے کہ یہ فلاں موقع پر نازل ہوئی تھی تو دراصل اس سے مراد یہ نہیں ہوتی ہے کہ جب یہ واقعہ پیش آیا اسی وقت یہ آیت نازل ہوئی تھی، بلکہ مراد یہ ہوتی ہے کہ یہ آیت اس واقعہ پر چسپاں ہوتی ہے۔ امام سیوطیؒ نے اتقان میں حافظ ابن تیمیہؒ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ''راوی جب یہ کہتے ہیں کہ یہ آیت فلاں معاملہ میں نازل ہوئی ہے تو کبھی اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ وہی معاملہ اس کے نزول کا سبب ہے اور کبھی اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ معاملہ اس آیت کے حکم میں داخل ہے، اگرچہ وہ اس کے نزول کا سبب نہ ہو'' آگے چل کر وہ امام بدرالدین زرکشیؒ کا قول ان کی کتاب 'البرہان فی علوم القرآن' سے نقل کرتے ہیں کہ ''صحابہ اور تابعین کی یہ عادت معروف ہے کہ ان میں سے کوئی شخص جب یہ کہتا ہے کہ یہ آیت فلاں معاملہ میں نازل ہوئی تھی تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ اس آیت کا حکم اس معاملہ پر چسپاں

ہوتا ہے، نہ یہ کہ وہی اس واقعہ کے نزول کا سبب ہے۔ پس دراصل اس کی نوعیت آیت کے حکم سے استدلال کی ہوتی ہے نہ کہ بیان واقعہ کی"(الاتقان فی علوم القرآن، جلد اول ،صفحہ ۳۱ ،طبع ۱۹۲۹ء)۔ (تفہیم القرآن، سورۂ دہر، جلد ششم)

شانِ نزول کے سلسلے میں یہی بات مولانا حمید الدین فراہیؒ نے بھی مقدمہ تفسیر نظام القرآن میں کہی ہے اور انھوں نے بھی امام زرکشیؒ کا حوالہ دیا ہے۔

قرآن کی تاویل کا صحیح طریقہ

اس ضمن میں مولانا مودودیؒ لکھتے ہیں کہ ''سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ آپ قرآن کی تاویل وتعبیر کا صحیح طریقہ اچھی طرح سمجھ لیں۔آپ جس آیت کے معنیٰ سمجھنا چاہتے ہوں پہلے عربی زبان کے لحاظ سے اس کے الفاظ اور ترکیب (Construction) پر غور کریں، پھر اسے سیاق وسباق (Context) میں رکھ کر دیکھیں، پھر اسی مضمون سے تعلق رکھنے والی جو دوسری آیات قرآن میں مختلف مقامات پر موجود ہیں ان کو جمع کر کے دیکھیں کہ زیر بحث آیت کی ممکن تعبیرات میں سے کون سی تعبیر ان سے مطابقت رکھتی ہے اور کون سی تعبیرات ان سے خلاف پڑتی ہے (اور یہ ظاہر ہے کہ ایک قائل کا کوئی قول اگر دو یا زائد تعبیرات کا متحمل ہو تو اس کی وہی تعبیر معتبر سمجھی جائے گی جو اسی مضمون کے متعلق اس کی دوسری تصریحات سے مطابقت رکھتی ہو) اس حد تک قرآن کا مطلب خود قرآن سے معلوم کرنے کوشش جب آپ کر لیں تو اس کے بعد یہ بھی دیکھئے کہ جو شخص دراصل اس قرآن کو پیش کرنے والا تھا اس کے قول وعمل سے قرآن کی زیرِ بحث آیت کے مفہوم پر کیا روشنی پڑتی ہے اور جو لوگ اس کے قریب ترین زمانہ میں اس کے پیرو تھے وہ اس آیت کا کیا مطلب سمجھتے تھے''۔ (رسائل ومسائل، جلد سوم، ص ۱۶)

قرآن کی تاویل میں حدیث کی اہمیت

حدیث، شریعت کا دوسرا ماخذ ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی پوری زندگی قرآن کی تفسیر تھی۔حضرت عائشہؓ کا مشہور قول ہے کہ ''قرآن آپؐ کا اخلاق تھا''۔اس سے مترشح ہوتا ہے کہ آپؐ کی پوری زندگی قرآن کی بہترین تفسیر ہے۔مولانا مودودیؒ نے اپنی تفسیر میں رسول اللہ

ﷺ کی زندگی کے ہر پہلو سے قرآن کی تفسیر بیان کی ہے۔ آپؐ کی حیات طیبہ سے قرآن کی تفسیر بیان کرنا اور احادیثِ رسول اور تاریخی شواہد سے استشہاد کرنا اس تفسیر کی بہت بڑی خوبی ہے۔ قرآن کی تفسیر وتاویل میں حدیث کی اہمیت کے بارے میں مولانا فرماتے ہیں:

''میں کہتا ہوں کہ ایک شخص خواہ قرآن کو محمد ﷺ کی تصنیف سمجھتا ہو یا یہ سمجھتا ہو کہ یہ خدا کی کتاب ہے اور محمد ﷺ خدا کے رسول ہیں، دونوں صورتوں میں اس کا یہ دعوی کرنا غلط ہوگا کہ اسے قرآن کو سمجھنے کے لئے محمد ﷺ کے قولی وعملی تشریح سے مدد لینے کی کوئی حاجت نہیں ہے۔ اگر وہ اسے آں حضرت کی تصنیف سمجھتا ہے تو اسے ماننا ہوگا کہ مصنف نے اس کی جو تشریح بھی کی ہو وہی اس کا اصل مدعا ہے۔ اور اگر وہ اسے خدا کا کلام مانتا ہے اور یہ تسلیم کرتا ہے کہ خدا ہی نے اس کی تعلیم دینے کے لئے محمد ﷺ کو مامور کیا تھا تب بھی اسے یہ ماننا پڑے گا کہ خدا کے کلام کا جو مفہوم محمد ﷺ نے سمجھا ہے وہی اس کا مستند مفہوم ہے۔ یہ ایک الگ بحث ہے کہ کوئی حدیث جو محمد ﷺ کی طرف منسوب کی جاتی ہو، صحیح ہے یا نہیں اور اس کے صحیح ہونے یا نہ ہونے کے دلائل کیا ہیں، مگر بجائے خود یہ بات نا قابلِ انکار ہے کہ قرآن کو سمجھنے میں ہم حدیث سے بے نیاز نہیں ہو سکتے''۔ (رسائل ومسائل، جلد سوم)

قرآن وحدیث کے باہمی ربط کے بارے میں وہ ایک سوال کے جواب میں لکھتے ہیں: ''حدیث قرآن کی جس طرح تشریح کرتی ہے اس کی مثالوں میں سے چند یہ ہیں: قرآن کہتا ہے کہ چور کا ہاتھ کاٹا جائے، اس میں چوری کی کوئی حد مقرر نہیں کی گئی ہے، حتی کہ اگر اپنا بچہ ایک پیسہ آپ کی جیب سے نکال لے تو وہ بھی چور قرار دیا جاسکتا ہے۔ ہاتھ کی بھی کوئی حد نہیں بتائی گئی ہے، سیدھا یا بایاں، ؟ کلائی کے پاس سے یا شانے کے پاس سے یا کہنی کے پاس سے؟ ان سب امور کے متعلق سارے تعیّنات حدیث میں کیے گئے ہیں۔ انہیں آپ نظر انداز کر دیں تو اندازہ کر لیجیے کہ حکم کی تعمیل میں کیسی کچھ زیادتیاں ہوسکتی ہیں۔ قرآن حج کی فرضیت کا عام حکم دیتا ہے اور یہ صراحت نہیں کرتا کہ آیا ہر سال ہر مستطیع مسلمان پر فرض ہے یا عمر میں ایک مرتبہ ادا کرنا کافی ہے؟ مؤخر الذکر بات صرف حدیث سے معلوم ہوسکتی ہے۔ اگر آپ اسے قبول نہ کریں تو قرآنی حکم کے عموم کا تقاضا یہ ہے کہ ہر سال ہر مستطیع مسلمان حج کے لیے جائے۔ قرآن چند اقسام کی عورتوں کو حرام قرار دینے کے بعد کہتا ہے کہ ان کے ما سوا دوسری عورتوں سے نکاح کرنا تمہارے لئے حلال ہے۔ ان حرام کی ہوئی عورتوں میں محرّ مات ابدیہ

کے علاوہ صرف سالی کا ذکر ہے، جبکہ اس کی بہن آدمی کے نکاح میں زندہ موجود ہو، عورت کی خالہ اور پھوپھی کا ذکر نہیں ہے۔ یہ بات حدیث سے معلوم ہوتی ہے کہ عورت کی اپنی بہن کی طرح اس کے باپ کی بہن اور اس کی ماں کی بہن بھی اس کے ساتھ ایک شخص کے نکاح میں جمع نہیں ہوسکتیں۔ اس تشریح کو نظر انداز کیا جائے تو آدمی حکم کے عموم سے غلط اٹھا کر وہی خرابی برپا کرسکتا ہے جس سے روکنے کے لیے شریعت نے جمع بین الاختین کو حرام کیا ہے۔ قرآن سونے اور چاندی کے جمع کر رکھنے پر سخت وعید کرتا ہے۔ سورۂ توبہ کی آیت ۳۵، ۳۶ کے الفاظ ملاحظہ فرمالیں۔ اس کے عموم میں اتنی گنجائش بھی نہیں ہے کہ آپ سونے یا چاندی کا ایک تار بھی رکھ سکیں۔ یہ حدیث ہی ہے جس نے اس کے منشا کی توضیح وتشریح کی ہے۔ قرآن میں کسی حکم کا نہ ہونا اور حدیث میں ہونا یہ معنی رکھتا ہے کہ حدیث قرآن سے زائد ایک حکم بیان کرتی ہے نہ یہ کہ حدیث قرآن کے مخالف حکم دے رہی ہے۔ مثلاً نماز کی رکعات اور اس میں پڑھی جانے والی عبارات اور نماز کی دوسری تفصیلات قرآن میں نہیں ہیں۔ حج کے تمام مناسک قرآن میں بیان نہیں ہوئے ہیں۔ زکوٰۃ کا نصاب اور اس کی شرحیں اور دوسری تفصیلات قرآن میں نہیں ہیں۔ اذان کے الفاظ قرآن میں نہیں ہیں۔ اس طرح کے جتنے زائد احکام ہم کو حدیث سے ملتے ہیں وہ قرآن سے زائد ضرور ہیں، مگر اس کے خلاف نہیں ہیں۔ قرآن کے خلاف ہونا یہ ہے قرآن ایک چیز کا حکم دے اور حدیث اس سے منع کرے، یا اس کے برعکس قرآن منع کرے اور حدیث اس کا حکم دے، ایسی کوئی مثال کسی صحیح حدیث میں نہیں پائی جاتی''۔ (رسائل ومسائل، حصہ سوم، ص ۱۸۰-۱۸۱)

قرآن میں مضامین کی تکرار

مولانا مودودیؒ سورتوں کے دیباچہ میں جہاں سورتوں کا تجزیہ کرتے اور ان کے مباحث اور مضامین بیان کرتے ہیں وہیں اگر کوئی سورہ مضمون کے اعتبار سے کسی دوسری سورہ سے مشابہ ہے تو اس کا ذکر کرکے سورتوں کے مابین مناسبت اور ربط قائم کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر وہ سورۂ قیامہ، سورۂ دہر، سورۂ مرسلات، سورۂ نبا اور سورۂ نازعات کو ایک ہی مضمون کی سورتیں قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں: ''سورۂ قیامہ سے سورۂ نازعات تک سب کا مضمون ایک دوسرے سے مشابہ ہے، یعنی قیامت اور آخرت کا اثبات اور اس کو ماننے اور نہ ماننے کے نتائج

سے لوگوں کو خبردار کرنا''۔ (تفہیم القرآن، جلد ششم، سورہ نبا)

دوسری جگہ فرماتے ہیں کہ ''سورۂ قیامہ اور سورۂ دہر اور اس کے بعد کی دو سورتیں سورۂ نبأ اور سورۂ نازعات اگر ملا کر پڑھی جائیں تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ یہ سب ایک ہی دور کی نازل شدہ سورتیں ہیں اور ایک ہی مضمون ہے جن کو ان میں مختلف پیرایوں میں اہل مکہ کے ذہن نشین کرایا گیا ہے'' (تفہیم القرآن، جلد ششم، سورۂ المرسلات) سورۂ نبأ میں فرماتے ہیں: ''سورۂ قیامہ سے سورۂ نازعات تک سب کا مضمون ایک دوسرے سے مشابہ ہے'' (تفہیم القرآن، جلد ششم، سورۂ نبأ)

اسی طرح مولانا سورۃ الشّمس اور سورۃ اللیل کو مشابہ قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ سورۃ اللیل کے دیباچہ میں فرماتے ہیں: ''اس کا مضمون سورۃ الشّمس سے اس قدر مشابہ ہے کہ یہ دونوں سورتیں ایک دوسرے کی تفسیر محسوس ہوتی ہیں۔ ایک ہی بات، جسے سورۂ شمس میں ایک طریقہ سے سمجھا گیا ہے اور اس سورہ میں دوسرے طریقہ سے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ دونوں قریب قریب ایک ہی زمانے میں نازل ہوئی ہیں''۔ مولانا دونوں سورتوں کے مضامین کی بھی وضاحت کرتے ہیں، چنانچہ سورۃ الشّمس کے بارے میں بیان کرتے ہیں کہ ''اس کا موضوع نیکی اور بدی کا فرق سمجھانا ہے اور ان لوگوں کو برے انجام سے ڈرانا ہے جو اس فرق کو سمجھنے سے انکار اور بدی کی راہ چلنے پر اصرار کرتے ہیں''۔ (تفہیم القرآن، جلد ششم، سورۂ شمس)

اور سورۃ اللیل کے بارے میں فرماتے ہیں: ''اس کا موضوع زندگی کے دو مختلف راستوں کا فرق اور ان کے انجام اور نتائج کا اختلاف بیان کرنا ہے''۔ (تفہیم القرآن، جلد ششم، سورۃ اللیل)

اسی طرح سورۃ الضحیٰ اور سورۂ الم نشرح کا زمانہ قریب قریب ایک اور ان کا مضمون ملتا جلتا قرار دیتے ہیں۔ لکھتے ہیں: ''اس کا (سورۂ الم نشرح کا) مضمون سورۂ ضحیٰ سے اس قدر ملتا جلتا ہے کہ یہ دونوں سورتیں قریب قریب ایک ہی زمانہ اور ایک ہی جیسے حالات میں نازل شدہ معلوم ہوتی ہیں۔ (تفہیم القرآن، جلد ششم، سورۃ الانشراح) اور سورۃ الضحیٰ کے بارے میں لکھتے ہیں: ''اس کا موضوع رسول اللہ ﷺ کو تسلی دینا اور مقصد اس پریشانی کو دور کرنا ہے جو نزولِ وحی کا سلسلہ رک جانے سے آپ کو لاحق ہوگئی تھی''۔ اور سورۂ الم نشرح کے بارے میں

بیان کرتے ہیں کہ اس کا مقصد اور مدعا بھی رسول اللہ ﷺ کو تسلی دینا ہے۔ نبوت سے پہلے حضور کو کبھی ان حالات سے سابقہ پیش نہیں آیا تھا جن کا سامنا نبوت کے بعد دعوت اسلامی کا آغاز کرتے ہوئے آپ کو کرنا پڑا۔ (تفہیم القرآن، جلد ششم، سورہ الانشراح)

سورتوں کے درمیان ربط ومناسبت

مولانا مودودیؒ مختلف سورتوں کے درمیان مناسبت اور ربط بھی بیان کرتے ہیں۔ مثلاً سورۂ علق، سورۂ قدر اور سورۂ البینہ کو ایک ساتھ رکھنے کی حکمت، ان سورتوں کے درمیان ربط و مناسبت اور ان کی مخصوص ترتیب کے بارے میں فرماتے ہیں: ''قرآن کی ترتیب میں اس کو (یعنی سورۂ البینہ کو) سورۂ علق اور سورۂ قدر کے بعد رکھنا بہت معنی خیز ہے۔ سورۂ علق میں پہلی وحی درج کی گئی ہے۔ سورۂ قدر میں بتایا گیا ہے کہ وہ کب نازل ہوئی ہے؟ اور اس سورہ میں بتایا گیا ہے کہ اس کتاب کے ساتھ ایک رسول بھیجنا کیوں ضروری تھا؟ (تفہیم القرآن، جلد ششم، سورۂ البینۃ)

اسی طرح سورۂ بقرہ اور سورۂ آل عمران کے درمیان ربط، پھر سورۂ بقرہ اور سورہ نساء کے درمیان ربط، پھر سورۂ آل عمران، سورۂ نساء اور سورۂ مائدہ کے مابین ربط کی وضاحت کی ہے۔

سورۂ بقرہ اور سورۂ آل عمران دونوں میں خطاب یہود و نصاریٰ اور اہل ایمان سے ہے، یہود و نصاریٰ کو جن باتوں کی تبلیغ سورۂ بقرہ میں کی گئی تھی مزید تبلیغ اسی انداز سے سورۂ آل عمران کی گئی ہے، اور سورۂ بقرہ میں اہل ایمان کو جن باتوں سے متنبہ کیا گیا تھا اسی سلسلے کی مزید ہدایات سورۂ آل عمران میں دی گئی ہیں۔ اس کی تفصیل مولانا مودودیؒ یوں بیان کرتے ہیں:

''سورہ (آل عمران) کا خطاب خصوصیت کے ساتھ دو گروہوں کی طرف ہے: ایک اہل کتاب (یہود و نصاریٰ)، دوسرے وہ لوگ جو محمد ﷺ پر ایمان لائے تھے۔ پہلے گروہ کو اسی طرز پر مزید تبلیغ کی گئی جس کا سلسلہ سورۂ بقرہ میں شروع کیا گیا تھا۔ دوسرے گروہ کو، جواب بہترین امت ہونے کی حیثیت سے حق کا علمبردار اور دنیا کی اصلاح کا ذمہ دار بنایا جا چکا ہے، اسی سلسلے میں مزید ہدایات دی گئی ہیں، جو سورۂ بقرہ میں شروع ہوا تھا''۔ (تفہیم القرآن، جلد ا، سورۂ آل عمران)

اسی طرح سورۂ بقرہ کو سورۂ نساء سے یوں مربوط کرتے ہیں: ''اسلامی سوسائٹی کی تنظیم کے لیے سورۂ بقرہ میں جو ہدایات دی گئی تھیں، اب یہ سوسائٹی ان سے زائد ہدایات کی طالب تھی، اس لیے سورۂ نساء کے ان خطبوں میں زیادہ تفصیل کے ساتھ بتایا گیا کہ مسلمان اپنی

اجتماعی زندگی کو اسلام کے طریق پر کس طرح درست کریں؟ (تفہیم القرآن، جلد ا، سورۂ نساء)

سورۂ آل عمران اور سورۂ نساء کا ربط سورہ المائدہ سے یوں قائم کرتے ہیں: ''سورۂ آل عمران اور سورۂ نساء کے زمانۂ نزول سے اس سورہ (مائدہ) کے نزول تک پہنچتے پہنچتے حالات میں بڑا تغیر واقع ہو چکا تھا... مدینہ کے چاروں طرف تمام مخالف قبائل کا زور ٹوٹ گیا، مدینہ پر جو یہود خطرہ ہر وقت منڈلاتا رہتا تھا اس کا ہمیشہ کے لیے استیصال ہو گیا اور سب مدینہ کی حکومت کے باج گزار بن گئے۔ اسلام کو دبانے کے لیے قریش نے آخری کوشش غزوۂ خندق کے موقع پر کی اور اس میں وہ سخت ناکام ہوئے۔ اس کے بعد اہل عرب کو اس امر میں کچھ شک نہ رہا کہ اسلام کی تحریک اب کسی کے مٹائے نہیں مٹ سکتی۔ اب اسلام محض ایک عقیدہ و مسلک ہی نہ تھا، جس کی حکم رانی صرف دلوں اور دماغوں تک محدود ہو، بلکہ وہ ایک ریاست بھی تھا جس کی حکم رانی عملاً اپنے حدود میں رہنے والے تمام لوگوں کی زندگی پر محیط تھی۔ اب مسلمان اس طاقت کے مالک ہو چکے تھے کہ جس مسلک پر وہ ایمان لائے تھے، بے روک ٹوک اس کے مطابق زندگی بسر کر سکیں اور اس کے سوا کسی دوسرے عقیدہ و مسلک یا قانون کو اپنے دائرہ حیات میں دخل انداز نہ ہونے دیں۔ پھر ان چند برسوں میں اسلامی اصول اور نقطۂ نظر کے مطابق مسلمانوں کی ایک اپنی مستقل تہذیب بن چکی تھی جو زندگی کی تمام تفصیلات میں دوسروں سے الگ اپنی ایک امتیازی شان رکھتی تھی ... یہ حالات تھے جب سورۂ مائدہ نازل ہوئی۔ یہ سورہ تین بڑے بڑے مضامین پر مشتمل ہے۔ (۱) مسلمانوں کی مذہبی، تمدنی اور سیاسی زندگی کے متعلق مزید احکام و ہدایات، (۲) مسلمانوں کو نصیحت (۳) یہودیوں اور عیسائیوں کو نصیحت۔ (تفہیم القرآن، جلد اول، سورہ المائدہ)

سورۂ زلزال سے سورۂ الہمزۃ تک چھ سورتیں ہیں۔ ان کے درمیان باہم کیا ربط ہے، اس کی وضاحت کرتے ہوئے مولانا مودودیؒ فرماتے ہیں: ''اس سورۃ (الہمزہ) کو اگر ان سورتوں کے تسلسل میں رکھ کر دیکھا جائے جو سورۂ زلزال سے یہاں تک چلی آ رہی ہیں تو آدمی بڑی اچھی طرح یہ سمجھ سکتا ہے کہ مکہ معظّمہ کے ابتدائی دور میں کس طریقہ سے اسلام کے عقائد اور اس کی اخلاقی تعلیمات کو لوگوں کے ذہن نشین کیا گیا تھا۔ سورۂ زلزال میں بتایا گیا کہ آخرت میں انسان کا پورا نامۂ اعمال اس کے سامنے رکھ دیا جائے گا اور کوئی ذرہ برابر نیکی یا بدی

بھی ایسی نہ ہوگی جو اس نے دنیا میں کی ہو اور وہ وہاں اس کے سامنے نہ آ جائے۔ سورۂ عادیات میں اس لوٹ مار، کشت وخون اور غارت گری کی طرف اشارہ کیا گیا جو عرب میں ہر طرف برپا تھی، پھر یہ احساس دلانے کے بعد کہ خدا کی دی ہوئی طاقتوں کا یہ استعمال اس کی بہت بڑی ناشکری ہے، لوگوں کو یہ بتایا گیا کہ معاملہ اسی دنیا میں ختم نہیں ہو جائے گا، بلکہ موت کے بعد دوسری زندگی میں تمہارے افعال ہی کی نہیں، تمہاری نیتوں تک کی جانچ پڑتال کی جائے گی اور تمہارا رب خوب جانتا ہے کہ کون آدمی کس سلوک کا مستحق ہے۔ سورۂ قارعہ میں قیامت کا نقشہ پیش کرنے کے بعد لوگوں کو خبردار کیا گیا کہ آخرت میں انسان کے اچھے یا برے انجام کا انحصار اس پر ہوگا کہ اس کی نیکیوں کا پلڑا بھاری ہے یا ہلکا۔ سورۂ تکاثر میں اس مادہ پرستانہ ذہنیت پر گرفت کی گئی ہے جس کی وجہ سے لوگ مرتے دم تک بس دنیا کے فائدے اور لذتیں اور عیش وآرام اور جاہ ومنزلت زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے اور ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں، پھر اس غفلت کے برے انجام سے آگاہ کر کے لوگوں کو بتایا گیا کہ یہ دنیا کوئی خوان یغما نہیں کہ اس پر جتنا اور جس طرح چاہو ہاتھ مارو، بلکہ ایک ایک نعمت، جو یہاں تمہیں مل رہی ہے، اس کے لیے تمہیں اپنے رب کو جواب دینا ہوگا کہ اسے تم نے کیسے حاصل کیا اور حاصل کر کے اس کو کس طرح استعمال کیا۔ سورۂ عصر میں بالکل دوٹوک طریقے سے بتا دیا گیا کہ نوع انسانی کا ایک ایک فرد، ایک ایک گروہ، ایک ایک قوم، حتیٰ کہ پوری دنیائے انسانیت خسارے میں ہے اگر اس کے افراد میں ایمان وعمل صالح نہ ہو اور اس کے معاشرے میں حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین کا رواج عام نہ ہو۔ اس کے معاً بعد سورۂ ہمزہ آتی ہے، جس میں جاہلیت کی سرداری کا ایک نمونہ پیش کر کے لوگوں کے سامنے گویا یہ سوال رکھ دیا گیا کہ یہ کردار آخر خسارے کا موجب کیوں نہ ہو؟ (تفہیم القرآن، جلد ششم، سورۃ الھمزہ)

ان شواہد سے بہ خوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ مولانا مودودیؒ سورتوں کے درمیان ہم آہنگی اور ربط ونظم کی وضاحت کرتے ہیں اور تشریح وتفسیر کے دوران بہ ظاہر بے ربط مضمون آجانے پر اس طرح وضاحت کرتے ہیں کہ پورا مضمون مربوط نظر آنے لگتا ہے۔ مثلاً سورۂ آل عمران آیت نمبر ۱۲۹ میں جنگِ احد پر تبصرہ ہو رہا تھا، اچانک یہ حکم دیا گیا کہ ''اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، یہ بڑھتا اور چڑھتا سود کھانا چھوڑ دو اور اللہ سے ڈرو'' (آل عمران، آیت ۱۳۰)

اس موقع پر مولانا یوں تشریح کرتے ہیں: ''احد کی شکست کا بڑا سبب یہ تھا کہ مسلمان عین کامیابی کے موقع پر مال کی طمع سے مغلوب ہو گئے اور اپنے کام کو تکمیل تک پہنچانے کے بجائے غنیمت لوٹنے میں لگ گئے۔ اس لیے حکیم مطلق نے اس حالت کی اصلاح کے لیے زر پرستی کے سرچشمے پر بند باندھنا ضروری سمجھا اور حکم دیا کہ سودخواری سے باز آؤ، جس میں آدمی رات دن اپنے نفع کے بڑھنے اور چڑھنے کا حساب لگاتا رہتا ہے اور جس کی وجہ سے آدمی کے اندر روپے کی حرص بے حد بڑھتی چلی جاتی ہے'' (تفہیم القرآن، جلد اول، سورہ آل عمران، حاشیہ ۹۸)

سیاق وسباق کی رعایت

مولانا مودودیؒ تفسیر بیان کرتے وقت سیاق وسباق کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ وہ سلسلۂ کلام کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ سیاق وسباق سے ہٹ کر معنی اخذ کرنے سے لاطائل تاویلوں کا دروازہ کھلتا ہے اور آیت کے معنی ومفہوم کو متعین کرنے میں غلطی سرزد ہوتی ہے۔

سورۂ النحل میں ہے:

وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلَى بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ فَمَا الَّذِينَ فُضِّلُوا بِرَادِّي رِزْقِهِمْ عَلَى مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَهُمْ فِيهِ سَوَاءٌ أَفَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَجْحَدُونَ (آیت:۷۱)

(اور دیکھو، اللہ نے تم میں سے بعض کو بعض پر رزق میں فضیلت عطا کی ہے، پھر جن لوگوں کو یہ فضیلت دی گئی ہے وہ ایسے نہیں ہیں کہ اپنا رزق اپنے غلاموں کی طرف پھیر دیا کرتے ہوں، تاکہ دونوں اس رزق میں برابر کے حصہ دار بن جائیں۔ تو کیا اللہ ہی کا احسان ماننے سے ان لوگوں کو انکار ہے)۔

اس آیت کی تشریح میں مولانا فرماتے ہیں: ''زمانۂ حال میں اس آیت سے جو عجیب وغریب معنی نکالے گئے ہیں وہ اس امر کی بدترین مثال ہیں کہ قرآن کی آیات کو ان کے سیاق وسباق سے الگ کر کے ایک ایک آیت کے الگ معنی لینے سے کیسی کیسی لاطائل تاویلوں کا دروازہ کھل جاتا ہے۔ لوگوں نے اس آیت کو اسلام کے فلسفۂ معیشت کی اصل اور قانونِ معیشت کی اہم دفعہ ٹھیرایا ہے۔ ان کے نزدیک آیت کا منشا یہ ہے کہ جن لوگوں کو اللہ نے رزق میں فضیلت عطا کی ہو انہیں اپنا رزق اپنے نوکروں اور غلاموں کی طرف ضرور لوٹا دینا چاہیے،

اگر نہ لوٹائیں گے تو اللہ کی نعمت کے منکر قرار پائیں گے، حالانکہ اس سلسلۂ کلام میں قانونِ معیشت کے بیان کا سرے سے کوئی موقع ہی نہیں ہے۔ اوپر سے تمام تقریر شرک کے ابطال اور توحید کے اثبات میں ہوتی چلی آرہی ہے اور آگے بھی یہی مضمون چل رہا ہے۔ اس گفتگو کے بیچ میں یکا یک قانونِ معیشت کی ایک دفعہ بیان کر دینے کا آخر کون سا تُک ہے؟ آیت کو اس کے سیاق و سباق میں رکھ کر دیکھا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اس کے بالکل برعکس مضمون بیان ہو رہا ہے۔ یہاں استدلال یہ کیا گیا ہے کہ تم خود اپنے مال میں اپنے غلاموں اور نوکروں کو جب برابر کا درجہ نہیں دیتے—— حالانکہ یہ مال خدا کا دیا ہوا ہے—— تو آخر کس طرح یہ بات تم صحیح سمجھتے ہو کہ جو احسانات اللہ نے تم پر کیے ہیں ان کے شکریے میں اللہ کے ساتھ اس کے بے اختیار غلاموں کو بھی شریک کر لو اور اپنی جگہ یہ سمجھ بیٹھو کہ اختیارات اور حقوق میں اللہ کے یہ غلام بھی اس کے ساتھ برابر کے حصہ دار ہیں؟ ٹھیک یہی استدلال، اسی مضمون سے سورۂ روم، آیت نمبر ۲۸ میں کیا گیا ہے۔ (تفہیم القرآن، جلد دوم، سورہ نحل، حاشیہ ۶۲)

قرآن کی ایسی تفسیر کی جائے جو اس کے مجموعی نظامِ فکر سے مطابقت رکھتی ہو

مولانا مودودیؒ فرماتے ہیں کہ اصولاً قرآن کی ہر آیت کی وہی تفسیر صحیح ہو سکتی ہے جو اس کے دوسرے بیانات اور اس کے مجموعی نظام فکر سے مطابقت رکھتی ہو۔ انھوں نے اس اصول کا بہت باریک بینی سے جائزہ لیا ہے، اس کے بارے میں اٹھنے والے سوالات کا جواب دیا ہے اور اس کے نتائج پر گفتگو کی ہے، پھر تفسیر کے سلسلہ میں کہاں بنیادی طور پر غلطی سرزد ہوئی ہے اس کی نشان دہی کی ہے۔ سورۂ انبیاء میں ہے:

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِن بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ. إِنَّ فِي هَٰذَا لَبَلَاغًا لِّقَوْمٍ عَابِدِينَ۔ (آیات: ۱۰۵-۱۰۶)

''اور زبور میں ہم نصیحت کے بعد یہ لکھ چکے ہیں کہ زمین کے وارث ہمارے نیک بندے ہوں گے، اس میں ایک بڑی خبر ہے عبادت گزار لوگوں کے لیے''۔

ان آیات کی تشریح میں مولانا فرماتے ہیں:

''اس آیت کا مطلب سمجھنے میں بعض لوگوں نے سخت ٹھوکر کھائی ہے اور اس سے

ایک ایسا مطلب نکال لیا ہے جو پورے قرآن کی تردید اور پورے نظامِ دین کی بیخ کنی کر دیتا ہے۔ وہ آیت کا مطلب یہ لیتے ہیں کہ دنیا کی موجودہ زندگی میں زمین کی وراثت (یعنی حکومت وفرماں روائی اور زمین کے وسائل پر تصرف) صرف صالحین کو ملا کرتی ہے اور انہی کو اللہ تعالیٰ اس نعمت سے نوازتا ہے۔ پھر اس قاعدۂ کلیہ سے وہ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ صالح اور غیر صالح کے فرق و امتیاز کا معیار یہی وراثتِ زمین ہے۔ جس کو یہ وراثت ملے وہ صالح ہے اور جس کو نہ ملے وہ غیر صالح۔ اس کے بعد وہ آگے بڑھ کر ان قوموں پر نگاہ ڈالتے ہیں جو دنیا میں پہلے وارثِ زمین رہی ہیں اور آج اس وراثت کی مالک بنی ہوئی ہیں۔ یہاں وہ دیکھتے ہیں کہ کافر، مشرک، دہریے، فاسق، فاجر، سب یہ وراثت پہلے بھی پاتے رہے ہیں اور آج بھی پا رہے ہیں۔ جن قوموں میں وہ تمام اوصاف پائے گئے ہیں اور آج پائے جاتے ہیں جنہیں قرآن صاف الفاظ میں کفر، فجور، معصیت اور بدی سے تعبیر کرتا ہے، وہ اس وراثت سے محروم نہیں ہوئیں، بلکہ نوازی گئیں اور آج بھی نوازی جاری ہیں۔ فرعون و نمرود سے لے کر اس زمانے کے کمیونسٹ فرماں رواؤں تک کتنے ہی ہیں جو کھلم کھلا خدا کے منکر، مخالف، بلکہ مدمقابل بنے ہیں اور پھر بھی وارثِ زمیں ہوئے ہیں۔ اس منظر کو دیکھ کر وہ یہ رائے قائم کرتے ہیں کہ قرآن کا بیان کردہ قاعدۂ کلیہ تو غلط نہیں ہوسکتا، اب لامحالہ غلطی جو کچھ ہے وہ 'صالح' کے اس مفہوم میں ہے جو اب تک مسلمان سمجھتے رہے ہیں۔ چنانچہ وہ صلاح کا ایک نیا تصور تلاش کرتے ہیں، جس کے مطابق زمین کے وارث ہونے والے سب لوگ یکساں صالح قرار پا سکیں، قطع نظر اس سے کہ وہ ابوبکر صدیقؓ اور عمر فاروقؓ ہوں یا چنگیز اور ہلاکو۔ اس نئے تصور کی تلاش میں ڈارون کا نظریۂ ارتقاء ان کی رہنمائی کرتا ہے اور وہ قرآن کے تصورِ صلاح کو ڈارونی تصورِ صلاحیت (Fitness) سے لے جا کر ملا دیتے ہیں۔

اس نئی تفسیر کی رو سے آیتِ زیرِ بحث کے معنی یہ قرار پاتے ہیں کہ جو شخص اور گروہ بھی مما لک کو فتح کرے اور ان پر زور قوت کے ساتھ اپنی حکومت چلانے اور زمین کے وسائل کو کامیابی کے ساتھ استعمال کرنے کی قابلیت رکھتا ہو وہی 'خدا کا صالح بندہ' ہے اور اس کا یہ فعل تمام 'عابد' انسانوں کے لیے پیغام ہے کہ 'عبادت' اس چیز کا نام ہے جو یہ شخص اور گروہ کر رہا ہے۔ اگر یہ عبادت تم نہیں کرتے اور نتیجہ میں وراثتِ زمین سے محروم رہ جاتے ہو تو نہ

تمہارا شمار صالحین میں ہوسکتا ہے اور نہ تم کو خدا کا عبادت گزار بندہ کہا جا سکتا ہے۔

یہ معنی اختیار کرنے کے بعد ان حضرات کے سامنے یہ سوال آیا کہ اگر 'صلاح' اور 'عبادت' کا تصور یہ ہے تو پھر وہ ایمان (ایمان باللہ، ایمان بالیوم الآخر، ایمان بالرسل اور ایمان بالکتب) کیا ہے جس کے بغیر، خود اس قرآن کی رؤ سے خدا کے ہاں کوئی عمل صالح مقبول نہیں؟ اور پھر قرآن کی اس دعوت کے کیا معنی کہ اس نظام اخلاق اور قانون زندگی کی پیروی کرو جو خدا نے اپنے رسول کے ذریعہ بھیجا ہے؟ اور پھر قرآن کا بار بار یہ کہنا کیا معنی رکھتا ہے کہ جو رسول کو نہ مانے اور خدا کے نازل کردہ احکام کا اتباع نہ کرے وہ کافر، فاسق، عذاب کا مستحق اور مغضوب بارگاہ خداوندی ہے؟ یہ سوالات ایسے تھے کہ اگر یہ لوگ ان پر ایمان کے ساتھ غور کرتے تو محسوس کر لیتے کہ ان سے اس آیت کا مطلب سمجھنے اور صلاح کا ایک نیا تصور قائم کرنے میں غلطی ہوئی ہے۔لیکن انہوں نے اپنی غلطی محسوس کرنے کے بجائے پوری جسارت کے ساتھ ایمان، اسلام، توحید، آخرت، رسالت، ہر چیز کے معنی بدل ڈالے، تاکہ وہ سب ان کی اس ایک آیت کی تفسیر کے مطابق ہو جائیں اور اس ایک چیز کو کو ٹھیک بٹھانے کی خاطر انہوں نے قرآن کے ساری تعلیمات کو الٹ پلٹ کر ڈالا۔اس پر لطیفہ یہ ہے کہ جو لوگ ان کی اس مرمتِ دین سے اختلاف کرتے ہیں، ان کو یہ الٹا الزام دیتے ہیں کہ خود بدلتے نہیں قرآن کو بدل دیتے ہیں۔ یہ دراصل مادی ترقی کی خواہش کا ہیضہ ہے جو بعض لوگوں کو اس بری طرح سے لاحق ہوگیا ہے کہ وہ قرآن کی معنوی تحریف کرنے میں بھی تامل نہیں کرتے۔

ان کی اس تفسیر میں پہلی بنیادی غلطی یہ ہے کہ یہ لوگ ایک آیت کی ایسی تفسیر کرتے ہیں جو قرآن کی مجموعی تعلیمات کے خلاف پڑتی ہے، حالاں کہ اصولاً قرآن کی ہر آیت کی وہی تفسیر صحیح ہوسکتی ہے جو اس کے دوسرے بیانات اور اس کے مجموعی نظام فکر سے مطابقت رکھتی ہو۔کوئی شخص، جس نے کبھی قرآن کو ایک دفعہ بھی سمجھ کر پڑھنے کی کوشش کی ہے، اس بات سے ناواقف نہیں رہ سکتا کہ قرآن جس چیز کو نیکی اور تقوی اور بھلائی کہتا ہے وہ 'مادی ترقی اور حکم رانی کی صلاحیت' کی ہم معنی نہیں ہے اور 'صالح' کو اگر 'صاحبِ صلاحیت' کے معنی میں لے لیا جائے تو یہ ایک آیت پورے قرآن سے ٹکرا جاتی ہے۔

دوسرا سبب، جو اس غلطی کا موجب ہوا ہے، یہ ہے کہ یہ لوگ ایک آیت کو اس کے

سیاق و سباق سے الگ کر کے بے تکلف جو معنی چاہتے ہیں اس کے الفاظ سے نکال لیتے ہیں، حالاں کہ ہر آیت کے صحیح معنی صرف وہی ہو سکتے ہیں جو سیاق و سباق سے مطابقت رکھتے ہوں۔ اگر یہ غلطی نہ کی جاتی تو آسانی کے ساتھ دیکھا جا سکتا تھا کہ اوپر سے جو مضمون مسلسل چلا آ رہا ہے وہ عالم آخرت میں مومنین صالحین اور کفار مشرکین کے انجام سے بحث کرتا ہے۔ اس مضمون میں یکا یک اس مضمون کے بیان کرنے کا آخر کون سا موقع تھا کہ دنیا میں وراثتِ زمین کا انتظام کس قاعدے پر ہو رہا ہے۔

تفسیر کے صحیح اصولوں کو ملحوظ رکھ کر دیکھا جائے تو آیت کا مطلب صاف ہے کہ دوسری تخلیق میں، جس کا ذکر اس سے پہلے کی آیت میں ہوا ہے، زمین کے وارث صرف صالح لوگ ہوں گے اور اس ابدی زندگی کے نظام میں موجودہ عارضی نظام زندگی سی کیفیت برقرار نہ رہے گی کہ زمین پر فاسقوں اور ظالموں کو بھی تسلط حاصل ہو جاتا ہے۔ یہ مضمون سورۂ مومنون آیات ۴-۱۱ میں بھی ارشاد ہوا ہے اور اس سے زیادہ صریح الفاظ میں سورۂ زمر کے خاتمہ پر بیان کیا گیا ہے، جہاں اللہ تعالیٰ قیامت اور نفخِ صور اول و ثانی کا ذکر کرنے کے بعد اپنی عدالت کا ذکر فرماتا ہے، پھر کفر کا انجام بیان کر کے نیک لوگوں کا انجام یہ بتاتا ہے کہ ''وَسِيْقَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ إِلَى الْجَنَّةِ زُمَراً حَتَّى إِذَا جَآؤُوْهَا وَفُتِحَتْ أَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا سَلَامٌ عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوهَا خٰلِدِيْنَ. وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ صَدَقَنَا وَعْدَهُ وَأَوْرَثَنَا الْأَرْضَ نَتَبَوَّأُ مِنَ الْجَنَّةِ حَيْثُ نَشَاء فَنِعْمَ أَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ'' آیات: ۷۳-۷۴ (اور جن لوگوں نے اپنے رب کے خوف سے تقوی اختیار کیا تھا وہ جنت کی طرف گروہ در گروہ لے جائے جائیں گے، یہاں تک کہ جب وہ وہاں پہنچ جائیں گے تو ان کے لیے جنت کے دروازے کھول دیے جائیں گے اور اس کے منتظم ان سے کہیں گے: سلام ہو تم کو، تم بہت اچھے رہے، آؤ، اب اس میں ہمیشہ رہنے کے لیے داخل ہو جاؤ۔ اور وہ کہیں گے کہ حمد ہے اس خدا کی جس نے ہم سے اپنا وعدہ پورا کیا اور ہم کو زمین کا وارث کر دیا، اب ہم جنت میں جہاں چاہیں اپنی جگہ بنا سکتے ہیں پس بہترین اجر ہے عمل کرنے والوں کے لیے)۔ دیکھیے، یہ دونوں آیتیں ایک ہی مضمون بیان کر رہی ہیں، اور دونوں جگہ وراثتِ زمین کا تعلق عالم آخرت سے ہے نہ کہ اس دنیا سے''۔ اس کے بعد مولانا نے حضرت داؤد علیہ السلام کے مزمور

سے حوالہ پیش کیا ہے کہ ''صادق زمین کے وارث ہوں گے اور اس میں ہمیشہ بسے رہیں گے''۔ مزمور آیات ۹-۱۰-۱۱-۱۸-۲۹ (تفہیم القرآن، جلد سوم، سورۂ انبیاء، حاشیہ ۹۹)

تفسیر میں شانِ کلام سے استدلال

مولانا مودودیؒ نے تفسیر قرآن کا ایک اہم نکتہ یہ بیان کیا ہے کہ شانِ کلام کو ملحوظ رکھنا چاہیے کہ اس سے معنیٰ اور مفہوم متعین کرنے میں مدد ملتی ہے۔ اگر وہ پیش نظر نہ ہو تو تفسیر میں غلطی کا احتمال رہتا ہے۔ مثال کے طور پر سورۂ یوسف کی آیت ہے:

ذٰلِکَ لِیَعْلَمَ اَنِّیْ لَمْ اَخُنْہُ بِالْغَیْبِ وَاَنَّ اللّٰہَ لَا یَھْدِیْ کَیْدَ الْخَآئِنِیْنَ (آیت:۵۲)

''(اس نے کہا) اس سے میری غرض یہ تھی کہ (عزیز) یہ جان لے کہ میں نے درپردہ اس کی خیانت نہیں کی تھی، اور یہ کہ جو خیانت کرتے ہیں ان کی چالوں کو اللہ کامیابی کی راہ پر نہیں لگاتا''۔

اس آیت کی تشریح میں مولانا فرماتے ہیں:

''یہ بات غالباً حضرت یوسفؑ نے اس وقت کہی ہوگی جب قید خانہ میں آپ کو تحقیقات کے نتیجے کی خبر دی گئی ہوگی۔ بعض مفسرین، جن میں ابن تیمیہؒ اور ابن کثیرؒ جیسے فضلاء بھی شامل ہیں، اس فقرے کو حضرت یوسف کا نہیں، بلکہ عزیز کی بیوی کے قول کا ایک حصہ قرار دیتے ہیں۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ یہ فقرہ امرأۃ العزیز کے قول سے متصل آیا ہے اور بیچ میں کوئی ایسا لفظ نہیں آیا ہے جس سے یہ سمجھا جائے کہ 'انہ لمن الصادقین' پر امرأۃ العزیز کی بات ختم ہوگئی اور بعد کا کلام حضرت یوسف کی زبان سے ادا ہوا۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر دو آدمیوں کے قول ایک دوسرے سے متصل واقع ہوں اور اس امر کی صراحت نہ ہو کہ یہ قول فلاں کا ہے اور یہ فلاں کا، تو اس صورت میں لازماً کوئی قرینہ ایسا ہونا چاہیے جس سے دونوں کے کلام میں فرق کیا جا سکے، اور یہاں ایسا کوئی قرینہ موجود نہیں ہے۔ اس لیے یہی ماننا پڑے گا کہ 'الآن حصحص' سے لے کر 'ان ربی غفور رحیم' تک پورا کلام امرأۃ العزیز کا ہی ہے، لیکن مجھے تعجب ہے کہ ابن تیمیہؒ جیسے دقیقہ رس آدمی تک کی نگاہ سے یہ بات کیسے چوک گئی کہ شان کلام بجائے خود ایک بہت بڑا قرینہ ہے جس کے ہوتے کسی اور قرینہ کی ضرورت نہیں رہتی۔ پہلا فقرہ تو بلا شبہ امرأۃ العزیز کے منہ پر پھبتا ہے، مگر کیا دوسرا فقرہ بھی اس کی حیثیت کے مطابق نظر آتا ہے؟ یہاں تو شان کلام صاف کہہ رہی ہے کہ اس کے قائل حضرت یوسفؑ ہیں،

نہ کہ عزیز مصر کی بیوی۔ اس کلام میں جو نیک نفسی، جو عالی ظرفی، جو فروتنی اور جو خدا ترسی بول رہی ہے وہ خود گواہ ہے کہ یہ فقرہ اس زبان سے نکلا ہوا نہیں ہوسکتا جس سے هَيْتَ لَكَ نکلا تھا، جس سے 'مَا جَزَاءُ مَنْ اَرَادَ بِاَهْلِكَ سُوْءً' نکلا تھا، اور جس سے بھری محفل کے سامنے یہ تک نکل سکتا تھا کہ 'لَئِنْ لَّمْ يَفْعَلْ مَا آمُرُهُ لَيُسْجَنَنَّ'۔ ایسا پاکیزہ فقرہ تو وہی زبان بول سکتی تھی جو اس سے پہلے 'مَعَاذَ اللّٰهِ اِنَّهُ رَبِّیْ اَحْسَنَ مَثْوَایَ' کہہ چکی تھی، جو 'رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِمَّا يَدْعُوْنَنِی اِلَيْهِ' کہہ چکی تھی، جو 'اِلَّا تَصْرِفْ عَنِّی كَيْدَهُنَّ اَصْبُ اِلَيْهِنَّ' کہہ چکی تھی۔ ایسے پاکیزہ کلام کو یوسف صدیق کے بجائے امرأۃ العزیز کا کلام ماننا اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک کوئی قرینہ اس امر پر دلالت نہ کرے کہ اس مرحلے پر پہنچ کر اسے توبہ اور ایمان اور اصلاحِ نفس کی توفیق نصیب ہوگئی تھی، اور افسوس ہے کہ ایسا کوئی قرینہ موجود نہیں ہے'۔ (تفہیم القرآن، جلد دوم، سورۂ یوسف، حاشیہ ۴۶)

قرآن کی غلط تفسیر کرنے والی روایات پر تنقید

مولانا مودودیؒ نے اپنی تفسیر کے دوران جگہ جگہ احادیث سے استشہاد کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ قرآن کو سمجھنے میں ہم حدیث سے بے نیاز نہیں ہوسکتے (رسائل و مسائل، حصہ سوم) لیکن کوئی ایسی روایت، جس سے پورے دین کی بنیاد ہی خطرے میں پڑ جائے، ان کے نزدیک قابل قبول نہیں ہے۔ وہ قرآن کی غلط تفسیر کرنے والی روایات پر جرح کرتے ہیں اور ان کے رد میں عقلی و نقلی دونوں طرح کی دلیلیں دیتے ہیں، محدثین و مفسرین کی آراء پیش کرتے ہیں اور درایت حدیث پر اٹھنے والے تمام سولات کے جوابات بھی دیتے ہیں، جیسا کہ سورۂ حج کے حاشیہ ۱۰۱ اور سورۂ انبیاء کے حاشیہ ۶۰ میں اس کی تفصیل موجود ہے (مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجیے رسائل و مسائل، حصہ دوم، ص ۳۲ تا ۳۴)

مکی سورتوں کی چار ادوار میں تقسیم

مولانا مودودیؒ نے مکی سورتوں کو چار ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ وہ ان ادوار کا ذکر ہر مکی سورہ کے دیباچہ میں کرتے ہیں اور اس کے زمانۂ نزول کو متعین کرتے ہوئے تفصیل سے ان حالات اور پس منظر کو پیش کرتے ہیں جس سے مکی زندگی کے مختلف ادوار پر روشنی پڑتی ہے۔ ان

ادوار کے مطالعہ سے دعوت اسلامی کو پیش کرنے کے طریقۂ کار اور اس کے منصوبوں کے بارے میں آگہی ہوتی ہے۔اس تقسیم سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک قرآن مجید کی تفسیر کا ایک اہم پہلو دعوت الی اللہ کی تاریخ کو اجاگر کرنا ہے۔ دعوت کے ان چاروں مراحل میں خفیہ و اعلانیہ دعوت، دعوت اسلامی کی کشمکش، صبر و آزمائش، ہجرتِ حبشہ اور سفرِ طائف کی پوری تاریخ آجاتی ہے۔ دعوتِ اسلامی کے یہ مراحل قاری کے لیے مشعل راہ ہیں۔

مولانا سورۂ انعام کے دیباچہ میں فرماتے ہیں: ''مکی سورتوں کے معاملہ میں ہم کو تاریخی شہادتوں کے بجائے زیادہ تر ان اندرونی شہادتوں پر اعتماد کرنا پڑتا ہے جو مختلف سورتوں کے موضوع، مضمون اور انداز بیان میں، اور اپنے پس منظر کی طرف ان کے جلی یا خفی اشارات میں پائی جاتی ہیں۔اور ظاہر ہے کہ اس نوعیت کی شہادتوں سے مدد لے کر ایک ایک سورۃ اور ایک ایک آیت کے متعلق یہ تعین نہیں کیا جاسکتا کہ فلاں تاریخ کو، یا فلاں سنہ میں فلاں موقع پر نازل ہوئی ہے۔زیادہ صحت کے ساتھ جو کچھ کہا جاسکتا ہے وہ یہ ہے کہ ایک طرف ہم مکی سورتوں کی اندرونی شہادتوں کو، اور دوسری طرف نبی ﷺ کی مکی زندگی کی تاریخ کو آمنے سامنے رکھیں اور پھر دونوں کا تقابل کرتے ہوئے یہ رائے قائم کریں کہ کون سی سورۃ کس دور سے تعلق رکھتی ہے۔اس طرز تحقیق کو ذہن میں رکھ کر جب ہم نبی ﷺ کی زندگی پر نگاہ ڈالتے ہیں تو وہ دعوت اسلامی کے نقطۂ نظر سے چار بڑے بڑے نمایاں ادوار پر منقسم نظر آتی ہے: پہلا دور آغازِ بعثت سے لے کر اعلانِ نبوت تک، تقریباً ۳ سال، دوسرا دور اعلان نبوت سے لے کر ظلم وستم اور فتنہ کے آغاز تک، تقریباً ۲ سال، تیسرا دور آغازِ فتنہ (۵ نبوی) سے لے کر ابوطالب اور حضرت خدیجہؓ کی وفات تک، تقریباً پانچ چھ سال، چوتھا دور ۱۰ نبوی سے لے کر ۱۳ نبوی تک تقریباً ۳ سال۔ (تفہیم القرآن، جلد اول، سورۂ انعام)

مولانا مودودیؒ نے تمام مکی سورتوں کی تفسیر میں دعوتی مراحل کو پیش نظر رکھا ہے اور ہر مکی سورت کے ذیل میں یہ صراحت کردی ہے کہ اس کا تعلق کس مرحلہ سے ہے۔

یہ مولانا مودودیؒ کی تفسیر تفہیم القرآن کا ایک مختصر مطالعہ ہے، جس کے ذریعے اس کے تفسیری منہج کو نمایاں کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔اس موضوع پر مزید تفصیل اور تحقیق کے ساتھ کام کرنے کی ضرورت ہے۔ ☆☆☆